لُٹے پٹے مہاجروں کی ہزارہا کی تعداد میں آمد شروع ہوگئی۔ بہرحال سب کی کوششوں اور تعاون سے یہ خطرناک دور گزر گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے اس میں سب سے نمایاں کردار عوام کے مذہبی جذبہ کا تھا۔

اس صورت حال میں یہ ضروری تھا کہ جمہور مسلمانوں کے مذہبی جذبہ کی تسکین اور اس کی صحت مند نشوونما کے لیے اس مملکت میں سازگار حالات پیدا کیے جاتے۔ ہندوستان کو چھوڑ کر آنے والوں میں سے ایک خاصی تعداد علمائے کرام اور دینی مدارس کے اساتذہ کی بھی تھی۔ ان حضرات نے جہاں بھی حالات سازگار پائے، دینی مدرسے قائم کرکے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تقسیم سے قبل سابق صوبہ سرحد سے طالب علموں کی ایک بہت بڑی تعداد دارالعلوم دیوبند جایا کرتی تھی۔ ظاہر ہے ۱۹۴۷ کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ دارالعلوم دیوبند ہی کے ایک عالم اور مدرس نے ضلع پشاور میں اکوڑہ کے مقام پر دارالعلوم حقانیہ کی بنیاد رکھی جو اس وقت اس نواح کی سب سے بڑی دینی درس گاہ ہے اور کثیر التعداد طلبہ وہاں زیر تعلیم ہیں۔ اسے اگر صوبہ سرحد کا دارالعلوم دیوبند کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ خاص لاہور میں جامعہ اشرفیہ قائم کی گئی۔ اسی طرح ملتان میں ایک سے زیادہ دارالعلوم وجود میں آگئے۔ کراچی میں اس وقت کئی دارالعلوم ہیں جہاں دیوبندی فضلا تعلیم دیتے ہیں۔ سندھ کے کئی شہروں میں دینی دارالعلوم کھل گئے ہیں۔

غرض جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے، ان بیس سالوں میں ملک میں نجی طور پر اتنے دینی مدرسے، درس گاہیں اور دارالعلوم قائم ہو چکے ہیں کہ ۱۹۴۷ میں اس سلسلے میں جو سخت کمی محسوس ہوتی تھی وہ بالکل نہیں رہی، اور اس اعتبار سے پاکستان خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ ان دارالعلوموں میں سے بہت سوں کی اپنی شاندار عمارتیں ہیں اور ان کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔

مغربی پاکستان کے اکثر شہروں میں غیر مسلم آبادی کافی تعداد میں تھی۔ ان کے جانے کے بعد ان کی جگہ جو مسلمان آباد ہوئے تو ان کے لیے مسجدیں نہیں تھیں جہاں وہ نمازیں ادا کر سکتے۔ اس عرصے میں بہت سے شہروں میں نئی مسجدیں بن گئی ہیں جو بڑی کشادہ، عالی شان اور خوب صورت ہیں۔ ان مسجدوں میں بالعموم درس قرآن ہوتا ہے اور وہ اپنے اپنے علاقے کی دینی سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔

یہ سب کچھ عام مسلمانوں کی مالی مدد اور علما کی کوششوں سے ہوا اور یہ ایک طرح سے عوام کی مذہبی زندگی کا مظہر ہے۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

اس دوران میں متعدد ایسے ادارے بھی وجود میں آئے جنھیں حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی اور انھوں نے دینی زندگی کے علمی اور ثقافتی پہلوؤں کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ ان اداروں میں سب سے پہلا ادارۂ ثقافت اسلامیہ ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۵۰ میں رکھی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد جتنے بھی دینی مدارس اور دارالعلوم کھولے گئے ان میں تمام تر پرانی طرز کی دینی تعلیم ہوتی ہے اور ان کا نصاب تعلیم بھی وہی پرانا ہے۔ ان درسگاہوں نے اپنے ہاں نئے علوم داخل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اب اگر ہم اسی پر اکتفا کر لیتے اور دینی ذہن صرف قدیم تک محدود ہو کر رہ جاتا تو یہ پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو تاریک اور اس کی آئندہ ترقی کی راہ کو مسدود کرنے کا باعث ہوتا۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ اور اس جیسے دوسرے اداروں نے اس عرصے میں یہ ایک بہت بڑی خدمت کی ہے کہ انھوں نے اسلامی ذہن کو جامد نہیں ہونے دیا اور مسلمانوں کے سامنے نئے دینی افکار پیش کر کے انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ قدیم طبقہ کو یہ کچھ برا تو لگا لیکن خود اس کی بقا اور اصلاح کے لیے یہ ضروری تھا۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے ان برسوں میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج کی زندگی کا شاید ہی کوئی اہم موضوع ہو جس پر ان میں بحث نہ کی گئی ہو اور اسلام کے نقطۂ نظر سے اس کے حسن و قبح کو سامنے نہ لایا گیا ہو۔ قدیم کو نئے رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور جدید کا قدیم روایات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ بے شک اس ادارہ کی طرف سے شائع کردہ بعض کتابوں پر اعتراضات ہوئے اور قدیم مسلک کے بعض علما نے اس کی تجدیدی سرگرمیوں کو ناپسند کیا، لیکن اس سے اتنا تو ہوا کہ ان حضرات کو اس امر کا احساس ہوا کہ ملک و قوم کو یہ مسئلے بھی درپیش ہیں اور ان پر انھیں غور کرنا ہوگا۔

ہمارے ہاں فکر کی کشتیِ نازک کو رواں کرنے میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کا بڑا حصہ ہے کیونکہ وہ اس میں پیش رو ہے اس لیے وہ سب سے بڑھ کر تعریف کا مستحق ہے۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اسلام کے حقائق کو جدید ذہن کے سامنے پیش کرے اور مسلمان نوجوانوں کو اسلام کی عقلی، ثقافتی اور روحانی روایات سے متعارف کرائے۔ ادارہ نے اس دوران میں یہ کوشش کی ہے کہ آج سائنسی اور مذہبی نقطہ ہائے نظر میں جو نزاع چل رہا ہے اسے حل کرے۔ اس کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ اسلام کا ایک ترقی پسند، عقلیت پر مبنی اور حقیقت پسندانہ تصور سامنے لائے اور اس وقت جو مسائل ہمیں درپیش ہیں ان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بتائے۔

قدیم طرز کے مکاتب خیال اور دینی درسگاہوں کے پہلو بہ پہلو اس قسم کے اداروں کی ضرورت خاص کر پاکستان جیسے ملک میں تھی۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے بہت حد تک اس ضرورت کو پورا کیا ہے۔

ادارۂ تحقیقات اسلامی

اسی ضرورت کے پیش نظر ۱۹۶۰ میں ایک اور ادارہ "ادارۂ تحقیقات اسلامی" کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس کا قیام دستور پاکستان کی ایک دفعہ کے تحت عمل میں آیا جس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ "صدر مملکت اسلامی تحقیقات اور اعلیٰ سطح پر اسلام کے مطالعہ تعلیم کی غرض سے ایک ادارہ قائم کرے گا تاکہ وہ خالص اسلامی بنیادوں پر مسلم معاشرہ کی تشکیل میں مدد دے سکے۔" ادارۂ تحقیقات اسلامی کے سرپرست خود صدر مملکت ہیں۔

اس ادارہ کے یہ مقاصد متعین کیے گئے ہیں:

(۱) اسلام کی بنیادی تعلیمات کو عقلی اور آزادانہ فکری پیرائے میں پیش کرنا اور من جملہ اور چیزوں کے اسلام نے انسانی اخوت، رواداری اور معاشرتی انصاف کے جو بنیادی اصول بتائے ہیں ان پر خاص کر زور دینا۔

(۲) اسلام کی تعلیمات کی ایسی تعبیر کرنا کہ جدید زمانے کی عقلی اور سائنسی ترقی کے پس منظر میں اسلام کا تخلیقی اور فعّال کردار واضح ہو سکے۔

(۳) انسانی فکر، سائنس اور ثقافت کی ترقی میں اسلام نے جو کچھ کیا ہے اس کی اس طرح تحقیق کرنا کہ مسلمان ان علوم و فنون میں آج ممتاز جگہ لے سکیں۔

(۴) اسلامی تاریخ، فلسفہ، قانون اور فقہ اور اصول فقہ میں خصوصی تحقیقات کا انتظام کرنا۔ پاکستان کے دستور میں ایک دفعہ یہ ہے کہ ملک میں کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں بنے گا اور جو قوانین پہلے سے چلے آتے ہیں انھیں کتاب وسنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی کا ایک کام یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں حکومت کی مدد کرے۔ چنانچہ اس کا ایک قانونی شعبہ ہے جو ہر مسئلے پر جو ادارہ کو بھیجا جاتا ہے، فقہ اسلامی کا نقطۂ نظر فراہم کرتا ہے۔ اس شعبے کے ارکان جدید قانون پر بھی نظر رکھتے ہیں اور فقہ اسلامی پر بھی انھیں عبور حاصل ہے۔

ادارہ کا ایک اہم مقصد اسلامی علوم وفنون پر تحقیقات کرنا ہے۔ ابھی حال ہی میں ادارہ کے ایک رکن نے "صدر اسلام میں اصول فقہ کا ارتقا" پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے جسے کراچی یونیورسٹی نے منظور کیا اور اس پر صاحب موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ اب وہ رکن "اجماع" پر کام کر رہے ہیں۔ ادارہ کی طرف سے ایک کتاب مجموعہ قوانین اسلامی شائع ہوئی ہے جس میں نکاح، طلاق اور اس طرح کے مسائل پر مختلف مذاہب فقہ کی آرا کو مدون کیا گیا ہے۔

ادارۂ تحقیقات اسلامی اس امر میں کوشاں ہے کہ فقہ، کلام اور غور وفکر کے طریقوں میں پچھلی پانچ چھ صدیوں میں جو تنگی اور جمود پیدا ہو گیا ہے اس میں وسعت اور آزادی خیال آئے، اور ہم اسلام کے اس دور سے ہدایت اور روشنی حاصل کریں جب مسلمان تمام علوم وفنون میں سب سے آگے تھے اور انھوں نے فکر وعمل اور ثقافت میں پوری دنیا کی رہنمائی کی تھی۔

محکمۂ اوقاف

ان بیس سالوں میں دینی واسلامی محاذ پر سب سے بڑا کام جو ہوا وہ مغربی پاکستان میں محکمۂ اوقاف کا قیام ہے۔ ۱۹۲۲-۲۳ کے بعد جب پنجاب میں سکھوں نے گوردواروں کو مہنتوں کے ذاتی قبضے سے نکال کر اپنی ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کر دیا اس وقت سے مسلمان بھی یہ سوچ رہے تھے کہ ان کے اوقاف کا بھی ایسا انتظام ہو جائے اور ان کی آمدنیاں متولیوں کی جیبوں میں جانے کے بجائے ملی مصالح پر صرف ہوں۔ مسلمانوں کی یہ دیرینہ آرزو ۱۹۶۰ میں جاکر پوری ہوئی۔ ایک قانون کے ذریعہ وہ تمام اوقاف جو مساجد، مزارات، اور درگاہوں سے متعلق تھے، ان کو

محکمۂ اوقاف کے تحت کر دیا گیا۔ اب محکمہ ہی ان کا انتظام کرتا اور ان کی آمدنیوں کو صرف کرتا ہے۔

اس مدت میں محکمۂ اوقاف نے ایک تو یہ کیا کہ مزارات کے نظم و نسق میں کافی اصلاحات کر دی ہیں اور بعض مزاروں پر عرس کے موقعے پر جو عام مخرب اخلاق حرکات ہوتی تھیں ان کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اب ان مزارات کی آمدنی مفید کاموں پر صرف ہوتی ہے جس کی سب سے عمدہ مثال داتا گنج بخش کے مزار کی ہے۔

جامعہ اسلامیہ

ایک اور اہم مسئلہ جس سے ہماری پوری دینی زندگی کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی وابستہ ہے، مساجد کے ائمہ و خطبا کا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے تو محکمۂ اوقاف نے کوئٹہ میں ایک اکیڈمی قائم کی جو ائمہ اور خطبا کو ضروری تربیت دیتی تھی۔ اب بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ اور اس کے ساتھ ہی ائمہ و خطبا کے لیے تربیت گاہ ہے۔ جامعہ اسلامیہ کا قیام دینی تعلیم کو نئے قالب پر ڈھالنے اور اسے قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو جمع کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ یہ جامعہ ابھی ابتدائی منازل میں ہے۔ جیسے جیسے عام دینی فکر میں آزادی اور کشادگی پیدا ہوگی اور مذہبی زندگی پر ایک خاص طبقۂ علما کا اس وقت جو تسلط ہے وہ کمزور ہوگا، اس جامعہ کی افادیت اور اہمیت کا احساس بڑھے گا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

سندھ کے ضلع ٹھٹھ میں ایک بزرگ اپنی زرعی اراضی اس مقصد کے لیے وقف کر گئے تھے کہ اس کی آمدنی سے حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی جائے۔ محکمۂ اوقاف نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ۱۹۶۲ میں حیدرآباد میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کی۔ یوں تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نام نامی اور ان کی تصنیفات و تعلیمات کا پہلے ہی سے چرچا تھا اور نہ صرف برعظیم بلکہ باہر کی اسلامی دنیا بھی ان کے افکار کی قدر کرتی تھی، لیکن شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام سے فائدہ یہ ہوا کہ فکرِ ولی اللّٰہی کو ایک تحریک کی صورت میں فروغ پانے کے لیے مواقع میسر آ گئے۔ اس اکیڈمی نے ایک ماہنامہ جاری کیا جو حضرت شاہ صاحب اور ان کے خانوادہ علمی کے افکار اور تعلیمات کی اشاعت کے لیے وقف ہے۔ اسی ماہنامہ کی بدولت شاہ صاحب اور ان کے توسط سے محکمۂ اوقاف کی اس

دینی خدمت کا ذکر برعظیم کے ہر اسلامی ادارہ تک پہنچا ہے جہاں کہ یہ رسالہ جاتا ہے۔

مسلمانوں کو نئے سرے سے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے فکر دینی کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ فکر تمام ماضی کا جامع ہے۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ وہ سب مذاہب فقہ و کلام و تصوف کو ملاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں نئی ترقیوں کو اپنانے اور انھیں اپنے اندر سمونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ وہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کو ایک نقطۂ اشتراک پر لا سکتا ہے اور جدید سائنس و فلسفہ کے وہ افکار جن کا آج دور دورہ ہے، شاہ صاحب کی اسلام کی تعبیر میں ان کے لیے بھی وسعت ہے۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کر کے محکمہ اوقاف نے ایک بڑی خدمت کی ہے۔

تصوف کی بعض بنیادی اور بڑی اہم کتابیں نایاب تھیں۔ محکمۂ اوقاف نے ان کی اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ ان میں سے بعض کتابیں چھپ گئی ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں۔

اسلامیات کی تعلیم

قیام پاکستان کے بعد اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا ہے اور تمام یونیورسٹیوں میں مستقل شعبہ ہائے اسلامیات قائم ہیں۔ ان میں بی۔ اے کے بعد داخلہ ہوتا ہے اور فارغ التحصیل طلبہ کو ایم۔ اے کی ڈگری ملتی ہے۔ یہی فارغ التحصیل اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم دیتے ہیں۔

امید ہے اس طرح قدیم اور جدید کے درمیان جو خلیج حائل ہے ـــــ اور وہ یہ ہے کہ قدیم تعلیم پائے ہوئے جدید علوم اور جدید زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بے خبر ہیں اور جدید تعلیم پائے ہوئے قدیم کو نہیں جانتے ـــــ بہ تدریج پُر ہوتی جائے گی، اور وہ وقت آجائے گا کہ پاکستانی مسلمان کی شخصیت صحیح معنوں میں قدیم اور جدید کی جامع ہوگی، اور اس وقت علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں جو بُعد ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔

قدیم اور جدید میں ہم آہنگی کی ضرورت

قدیم طرز پر دینی تعلیم دینے والے دارالعلوم اور مدارس اگر اپنی اسی روش پر مصر رہے کہ ان کے نصاب ہائے تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور وہ اپنی حدود میں کوئی جدید علم، کوئی جدید فکر اور کوئی

جدید اسلوب زندگی گھسنے نہیں دیں گے تو یہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا، اور آہستہ آہستہ ان کا وجود بے کار محض ہو جائے گا۔ فطرت کا یہ اصول ہے کہ جو چیز بے کار ہو جائے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر قدیم طرز کی ان درس گاہوں نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہ ڈھالا اور نئے علوم کے لیے اپنے دروازے نہ کھولے تو ان کا زیادہ دیر باقی رہنا مشکل ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب جدید اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے اور طالب علم اسلامیات میں ایم۔ اے کر سکتے ہیں تو قدیم طرز کی دینی درس گاہیں کیوں اپنے ہاں ایسے جدید علوم نہ پڑھائیں جو آج ضروری ہو گئے ہیں اور جن کے بغیر نہ اس زمانے کو اور اس کی ضرورتوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ آدمی خود اپنے لیے اور قوم و ملک کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

پوری دنیائے اسلام میں دُور رس تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ افغانستان اور یمن جیسے ملک جنھیں نئے زمانے کی ہوا تک نہیں لگتی تھی بدل رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے ہاں قدیم اور جدید گروہوں کا برسرپیکار ہونا انتہائی افسوس ناک ہے۔ آج مسلمانوں کو فکری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی ان سب محاذوں پر بڑے سنگین چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور ان سے وہ صرف اسی طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ماضی اور حال کو ہم آہنگ کریں اور بہتر مستقبل کی راہ نکالیں۔

پاکستان کے مسلمان قدیم اور جدید کی اس خلیج کو جتنی جلد بھریں ان کے لیے اچھا ہے۔

ہندوستان کے ایک مصنف جو جمعیۃ العلمائے ہند کے انگریزی رسالہ کے ایڈیٹر رہے، اور اب وہ ایک قوم پرست مسلمان ادارے میں کالج کے پرنسپل ہیں، اپنی ایک کتاب میں جو موصوف نے میک گل یونیورسٹی (کنیڈا) میں تحریر کی، لکھتے ہیں:

"اگر پاکستان آگے چل کر اسلام کی ایک ایسی نئی تعبیر پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جو ایک طرف اسلام کی صدیوں پرانی تاریخی روایات کے تمام بہترین اور صحت مند ترین عناصر کی حامل ہو اور دوسری طرف وہ ان چیلنجوں کا جو آج کے زمانے کے ہیں، عقلی لحاظ سے مناسب جوابات فراہم کرے تو اس صورت میں پاکستان کے قیام اور اس کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند کو جن مصائب سے گزرنا پڑا، اس کا معقول جواز نکل سکتا ہے۔"

اسی ضمن میں مصنف نے یہ بھی لکھا ہے

دینی خدمت کا ذکر برعظیم کے ہر اسلامی ادارہ تک پہنچا ہے جہاں کہ یہ رسالہ جاتا ہے۔

مسلمانوں کو نئے سر سے سے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے فکر دینی کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ فکر تمام ماضی کا جامع ہے۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ وہ سب مذاہب فقہ و کلام و تصوف کو ملاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں نئی ترقیوں کو اپنانے اور انھیں اپنے اندر سمونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ وہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کو ایک نقطۂ اشتراک پر لا سکتا ہے اور جدید سائنس و فلسفہ کے وہ افکار جن کا آج دور دورہ ہے، شاہ صاحب کی اسلام کی تعبیر میں ان کے لینے کی بھی وسعت ہے۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کر کے محکمہ اوقاف نے ایک بڑی خدمت کی ہے۔

تصوف کی بعض بنیادی اور بڑی اہم کتابیں نایاب تھیں۔ محکمۂ اوقاف نے ان کی اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ ان میں سے بعض کتابیں چھپ گئی ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں۔

اسلامیات کی تعلیم

قیام پاکستان کے بعد اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا ہے اور تمام یونیورسٹیوں میں مستقل شعبہ ہائے اسلامیات قائم ہیں۔ ان میں بی۔ اے کے بعد داخلہ ہوتا ہے اور فارغ التحصیل طلبہ کو ایم۔ اے کی ڈگری ملتی ہے۔ یہی فارغ التحصیل اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم دیتے ہیں۔

امید ہے اس طرح قدیم اور جدید کے درمیان جو خلیج حائل ہے ——— اور وہ یہ ہے کہ قدیم تعلیم پائے ہوئے جدید علوم اور جدید زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بے خبر ہیں اور جدید تعلیم پائے ہوئے قدیم کو نہیں جانتے ——— بہ تدریج پُر ہوتی جائے گی، اور وہ وقت آ جائے گا کہ پاکستانی مسلمان کی شخصیت صحیح معنوں میں قدیم اور جدید کی جامع ہو گی، اور اس وقت علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں جو بُعد ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

قدیم اور جدید میں ہم آہنگی کی ضرورت

قدیم طرز پر دینی تعلیم دینے والے دار العلوم اور مدارس اگر اپنی اسی روش پر مصر رہے کہ ان کے نصاب ہائے تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی اور وہ اپنی حدود میں کوئی جدید علم، کوئی جدید فکر اور کوئی

جدید اسلوب زندگی گھسنے نہیں دیں گے تو یہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا، اور آہستہ آہستہ ان کا وجود بےکار محض ہو جائے گا۔ فطرت کا یہ اصول ہے کہ جو چیز بےکار ہو جائے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر [illegible] ان درس گاہوں نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہ ڈھالا اور نئے علوم کے لیے [illegible] نے تو ان کا زیادہ دیر باقی رہنا مشکل ہے۔

[illegible] ہے کہ جب جدید اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم ضروری [illegible] ہے اور طالب علم اسلامیات میں [illegible] کر سکتے ہیں تو قدیم طرز کی دینی درس گاہیں [illegible] اپنے ہاں ایسے جدید علوم نہ پڑھائیں جو آج ضروری ہو گئے ہیں اور جن کے بغیر نہ اس [illegible] اور اس کی ضرورتوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ آدمی خود اپنے لیے اور قوم و ملک کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

پوری دنیائے اسلام میں دوررس تبدیلیاں آچکی ہیں۔ افغانستان اور یمن جیسے ملک جنھیں نئے زمانے کی ہوا تک نہیں لگتی تھی بدل رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے ہاں قدیم اور جدید گروہوں کا برسرپیکار ہونا انتہائی افسوس ناک ہے۔ آج مسلمانوں کو فکری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی ان سب محاذوں پر بڑے سنگین چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور ان سے وہ صرف اسی طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ماضی اور حال کو ہم آہنگ کریں اور بہتر مستقبل کی راہ نکالیں۔ پاکستان کے مسلمان قدیم اور جدید کی اس خلیج کو جتنی جلد بھریں ان کے لیے اچھا ہے۔

ہندوستان کے ایک مصنف جو جمعیۃ العلمائے ہند کے انگریزی رسالہ کے ایڈیٹر رہے، اور اب وہ ایک قوم پرست مسلمان ادارے میں کالج کے پرنسپل ہیں، اپنی ایک کتاب میں جو موصوف نے میک گل یونیورسٹی (کنیڈا) میں تحریر کی، لکھتے ہیں:

"اگر پاکستان آگے چل کر اسلام کی ایک ایسی نئی تعبیر پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جو ایک طرف اسلام کی صدیوں پرانی تاریخی روایات کے تمام بہترین اور صحت مند ترین عناصر کی حامل ہو اور دوسری طرف وہ ان چیلنجوں کا جو آج کے زمانے کے ہیں، عقلی لحاظ سے مناسب جوابات فراہم کرے تو اس صورت میں پاکستان کے قیام اور اس کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند کو جن مصائب سے گزرنا پڑا، اس کا معقول جواز نکل سکتا ہے۔"

اسی ضمن میں مصنف نے یہ بھی لکھا ہے

"یقینی طور سے پاکستان کے صرف اسی نہج پر ارتقا ہی میں بہ حیثیت ایک مسلم سلطنت کے اس کی طاقت وشوکت کا انحصار ہے۔ اقبال کے خواب بھی اسی طرح عملی جامہ پہن سکتے ہیں اور بنئے ہندوستان کے مسلمان شہریوں کے لیے بھی یہی چیز وجہ سکون ہو سکتی ہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا جواز اس میں ہے کہ وہاں متوازن اور ہم آہنگ جدید اسلام پھلے پھولے جو ایک طرف اپنے شاندار ماضی کے لیے باعث فخر ہو اور دوسری طرف بیسویں صدی کے چیلنجوں کے مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہو۔"

ایک متوازن، ہم آہنگ، ترقی کن اور تخلیقی صلاحیتوں کا حامل جدید اسلام پاکستان میں صرف اسی طرح بروئے کار آسکتا ہے، اگر قدیم اور جدید کی مخاصمت ختم ہو جائے اور دونوں مل کر ملت کے کارواں کو آگے بڑھائیں۔

اسلام کا نظریۂ حیات

از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

یہ خلیفہ صاحب کی انگریزی کتاب "اسلامک آئیڈیالوجی" کا ترجمہ ہے جس میں اسلام کے اساسی اصول وعقائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی نظریۂ حیات کی تشریح جدید انداز میں کی گئی ہے۔

قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ، لاہور